محمد اجمل

غالب

(فکر غالب پر ڈاکٹر نعیم احمد کے مقالے کے ساتھ ساتھ ہم یہاں غالب کے دو سو سالہ جشن ولادت پر غالب پر ایک دوسرا مقالہ بھی شائع کر رہے ہیں، جسے برصغیر کے معروف دانش ور مرحوم ڈاکٹر محمد اجمل نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر موصوف کی دانش وری، جذب و مستی اور فلسفہ و مذہب میں ان کی بصیرت اب محتاج بیان نہیں رہی۔)

یہ مختصر سا مقالہ میں نے اس لیے نہیں لکھا کہ غالب کے ذہن میں کسی قسم کا ذہنی مرض تلاش کروں، غالب کی سخنوری کا مقام بہت بلند ہے، لیکن جا بجا یہ احساس ہوتا ہے کہ اس سے بلند تر مقام حاصل کرنے کی کوشش اور آرزو کے باوجود غالب کی شخصیت میں بعض عناصر اور محرکات ایسے بھی ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ اعلیٰ مقام شاید حاصل نہیں کر سکے۔ تخلیقی عمل آگہی اور شعور کو متمول اور پہلودار بناتا ہے۔ اس کے باوجود جب تک انسان آگہی کو "انا" میں مدغم نہ کر دے تو سخنوری پیغمبری کا جزو نہیں بنتی۔ میں صرف ان محرکات اور عناصر کا ذکر کروں گا جن کی وجہ سے یہ رشک عرفی، و فخر طالب، ہزاروں نفسیاتی حقائق کو ژرف بینی اور باریک نظری سے بیان کرنے کے باوجود

تشنگی کا احساس چھوڑ جاتا ہے۔ یہاں میں یہ بھی کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ غالب نے جن نفسیاتی حقائق کا کمال حسن سے بیان کیا ہے ان میں اکثر و بیشتر وہ حقائق ہیں جو دفاعی حیثیت رکھتے ہیں' سپردگی اور روحانی تغیر کے متعلق جو بصیرتیں شخصیت میں قبولیت و انقلاب' سلبی و ایجابی پہلوؤں کا امتزاج ہوا کرتی ہیں وہ غالب میں کسی قدر کم نظر آتی ہیں۔

میرزا غالب کے متعلق کچھ کہنے کی جسارت محض اس لیے نہیں کر رہا کہ سخنہائے گفتنی دارم اور اس لیے بھی نہیں کر رہا کہ غالب کی شاعری کے متعلق جو متضاد مدارس فکر ہیں' ان میں سے کسی کی حمایت یا مخالفت کروں' مجھے نہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور اثر لکھنوی کے درمیان مناظرے سے سروکار ہے اور نہ قاضی عبدالودود اور مالک رام وغیرہم کے اختلاف یا اختلافات سے' میں تو بہت اختصار کے ساتھ غالب کے فقط چند شعروں کا حوالہ دے کر کچھ ان کے اجزائے نفس کا تجزیہ کروں گا' یہ تجزیہ فقط ایک پہلو کا ہو گا۔

کہتے ہیں کہ غالب کا کوئی استاد نہیں تھا اور جہاں تک شہادتیں یک جا ہو سکی ہیں' ان کی بنا پر مجھے یہ مفروضہ بہت حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد ایک فرضی نام ہے اور درحقیقت غالب نے طفولیت یا نوشابی کے زمانے میں کسی خاص استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا' میں یہ نہیں کہہ رہا کہ غالب نے اس ضمن میں دروغ گوئی سے کام لیا' سوپشتوں کی سپہ گری پر ناز کرنے والے انسان کو اپنی رومانی نسل کو بھی تو ماضی سے متعلق کرنا تھا اور اسے بھی بلند مرتبہ دینا تھا۔ اپنے روحانی تعلق کی بنا پر جہاں وہ یہ کہہ سکتا ہے۔

زحیدریم من وتو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

غالبا اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اعجاز تخیل سے ایک فاضل

اجل اور عالم بے بدل استاد کی تخلیق کرلے' میں اسے جھوٹ نہیں سمجھتا' میں اسے ایک "تخلیقی التباس" سمجھتا ہوں' جس کے بغیر شعر گوئی بھی غالبا امر محال ہے' لیکن تخلیقی التباس کو ذہنی حقیقت کا ایک پہلو سمجھ کر اسے ذہنی سطح پر صحیح تصور کرنا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اس استاد کو پہلے پارسی' آتش پرست ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر بعد میں مسلمان ہو گیا' آتش پرستی غالب کے تصور کا ایک اہم پہلو تھا اور یہ پرستش اس کے تفکر اور تدبر کا ایک لازمی انداز تھا اور اسی پرستش کی وجہ سے اس کے اندر گرمی اندیشہ پیدا ہوئی اور اسی پرستش کی بنا پر اس کی آگہی میں آشوب تھا۔

اس آشوب کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ غالب میں جا بجا ایک کیفیت کا اثبات ملتا ہے اور پھر فورا اس کے بعد اس کی تردید ہو جاتی ہے' کوئی کیفیت ایسی نہیں جو جم کر ثبات حاصل کر کے بڑھے اور پھلے پھولے' مثلا

بے خودی کردہ سبک دوش فراغے دارم
کوہ اندوہ رگ خواب گرانست مرا

اور اس کے فورا بعد فرماتے ہیں:۔

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے برقدم راہ روانست مرا

پھر کہتے ہیں:

سایہ و چشمہ بہ صحرا دم عیسیٰ دارد
اگر اندیشہ منزل نشود راہ زن ما

یہ ہاں اور نہ کی دو بدھا مستقل طور پر غالب میں ملتی ہے ان کی مشہور غزل جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔ بیاکہ قاعدۂ آسمان بگروانیم' کس قد امید آفریں جوش و خروش کے ساتھ اس کی ابتدا ہوئی ہے' لیکن اس کا مطلع ملاحظہ

ہو۔

بمن وصال تو باور نمی کند غالب
بیاکہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب کے ہاں اجزائے نفس کا تو احساس شدید ہے لیکن ان اجزا کو کسی شیرازہ میں یک جا کرنے کی صلاحیت کا شعور کم ہے۔ پارہ پارہ ہونے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا شعور تو ہے لیکن ان ٹکڑوں سے کوئی نئی ترکیب Cynthesis بنانے کی کوشش نہیں ہے۔ نار کی فراوانی ہے' لیکن اس میں نور بننے کی سکت نہیں ہے' جب ہم ذہنی کش مکش اور ہاں اور نہ کی دوبدھا کو تعقل اور ذہن کی سطح پر نہ لائیں اور دل کی گہرائیوں میں سلگنے دیں تو شخصیت میں تغیر پیدا ہوتا ہے' شکوہ و شکایت کے ساتھ ساتھ تسلیم و رضا کے جذبات بھی ملتے ہیں اور خودی اور بے خودی ایک ہی سمندر کی موجیں معلوم ہوتی ہیں' اسی لیے غالب کے وہ اشعار جو روحانی یا فلسفیانہ مطالب کے حامل ہیں' اکثر و بیشتر کسی روحانی مسئلے کا عاقلانہ جواب ڈھونڈتے ہیں' دل کی حرات گرمی اندیشہ بن جاتی ہے۔

یہ گرمی اندیشہ کیا چیز ہے؟ جب ہم اندیشہ اور تفکر کا تجزیہ کرتے ہیں' تو اس میں ہمیشہ ایک سرد مہری ایک برفانی قسم کی بے رخی اور بے نیازی پاتے ہیں' ایک معروضی کیفیت جو موضوعی حدت و تمازت سے محروم ہوتی ہے۔ خون جگر سے فلسفہ لکھا جا سکتا ہے اور ڈی ایچ لارنس کی طرح انسان خون کو کبریائی حیثیت بھی دے سکتا ہے' لیکن کیا جب غالب گرمی اندیشہ کا ذکر کرتے ہیں تو وہ دراصل سوز غم ہائے نہانی کی طرف اشارہ نہیں کر رہے۔ اگر وہ سوز غم ہائے نہانی کو اسی سطح پر رہنے دیتے تو شاید یہ معاملہ یہیں تک رہ جاتا لیکن غالب میں جا بجا یہ عمل دکھائی دیتا ہے کہ وہ سوز غم ہائے نہانی کو اندیشہ اور تفکر

کی سطح پر اس لیے لاتے ہیں کہ وہ غم کو دل کی سطح پر برداشت نہیں کر سکتے' انہیں یہ خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ غم دل میں رہا' تو انہیں پارہ پارہ کر دے گا' ان کے اجزائے نفس کا شیرازہ بکھر جائے گا' غم اندوہ کی آگ ان کے اندیشے میں سلگتی رہتی ہے اور یہی نار انا' ان کے وجود کو بقا اور ان کی شخصیت کو یک جہتی بخشتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ غالب نے یہ کہا:

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے
عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
اک خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

غالب کی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ انہیں یہ بھی خدشہ رہتا ہے کہ کہیں یہ سوز غمہائے نہانی' روشنی نہ بن جائے' یہ نار نور کا قالب نہ ڈھال لے اور نار نور تبھی بنتی ہے' جب انسان غمہائے نہانی کو برداشت کر لے' ان کی آگ میں جلنے پر آمادہ ہو اور راکھ بن کر نئے سرے سے روشن ہو اور نئے چراغ جلانے پر آمادہ ہو' غالب میں اس قسم کی آمادگی کہیں نظر نہیں آتی' دیر و حرم اس کے لیے واماندگی شوق کی پناہیں ہیں اور دیکھئے جاگیرداری رسم و رواج کو جا بجا غیرت اور خود داری کا نام دے کر کس کس طرح نور سے فرار کرتا ہے:۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بھی ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درکعبہ اگر وا نہ ہوا

اور پھر دیکھئے کہ غالب ہی کہتے ہیں

خلد را نہادم من لطف کوثر از من جو

کعبہ را سوارم من ماسوا' ازمن پرس

گرمی اندیشہ سے انا کو تابناک اور زندہ رکھنے والا شخص اس مقام پر کیسے پہنچ سکتا ہے' جہاں کعبہ اس کے گرد گھومنے لگے' اور اس کے منہ میں پتھر پانی میں ڈھل جائے۔

تشنہ لب برساحل دریا زغیرت جاں دہم

گر بموج افتد گمان چین پیشانی مرا

مجھے تو اس قسم کی غیرت اور خودداری میں وہ خود فریبی نظر آتی ہے' جو اکثر جاگیردارانہ رسم و رواج میں ہوتی ہے۔ یہ وہ روٹھ جانے کی کیفیت ہے جیسے قبائلی مزاج دشمنی یا عداوت کا لقب عطا کرتا ہے' موج کی چین شہانی پر ہی بات نہیں لیکن اگر موج کی چین شہانی کا شک بھی ہو جائے تو غالب پیاسا مرنے کو تیار ہے۔

پھر یہی حال دیکھئے سر پھوڑنے کی تمنا کا؟

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟

سوال یہ ہے کہ سر آپ کہیں پھوڑیں' محبوب کے آستاں پر نہ پھوڑیں۔ لیکن خیال تو محبوب ہی کا رہے گا' اس سے کیا فرق پڑتا ہے' فقط یہ کہ محبوب کی انا کے سامنے میری انا ہیچ اور کم تر نظر نہ آئے' اور غالب کی انا آگ تھی اور اس آگ کو نور بنانے کے لیے غالب کو اس آگ کو دل میں رکھنا اور برداشت کرنا تھا' کیونکہ یہ آگ دل میں رہ کر ہی نور بن سکتی ہے۔

(بہ شکریہ "اوراق" اپریل ۱۹۶۹ء)